دکن میں اردو زبان وادب کا ارتقا

اردو کی ابتدا کا مسئلہ محققین اور ماہرینِ لسانیات کے درمیان پیچیدگی کا باعث بنا رہا ہے۔ تاریخ کی گم شدہ کڑیوں کو سمیٹنا یوں بھی آسان نہیں ہوتا۔ پنجاب اور دہلی میں اردو کے بننے کا جو عمل ہمیں معلوم ہے، اس میں امیر خسرو کے علاوہ چودھویں صدی عیسوی تک کوئی دوسری شخصیت نہیں ملتی جس پر ادبی انحصار کیا جا سکے۔ امیر خسرو کی ہندوی تحریریں حالات کی نذر ہو گئیں۔ آج ان کے نام سے جو منسوب کلام ملتا ہے، انھیں حتمی طور پر یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ وہ خسرو سے ہی وابستہ ہیں۔ کم سے کم اتنا طے ہے کہ ان کی زبان 700 برس پرانی نہیں۔ اس وجہ سے اردو کا پہلا اہل قلم ماننے کے باوجود یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا ہندوی اثاثہ کون سا ہے اور کتنا ہے؟

محمد بن تغلق نے ایک سیاسی ضرورت کے تحت اپنے دارالسلطنت کو چودھویں صدی میں دہلی سے دکن منتقل کیا۔ تب بادشاہ کے قافلے کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں عالم، زبان داں اور مذہبی پیشوا دہلی سے دکن پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخی ثبوت موجود ہے کہ دکن میں یہ شمالی ہند کے اصحاب علم و دانش بڑی تعداد میں بس گئے۔ چودھویں صدی میں دکن میں بہمنی سلطنت کا عروج ہوتا ہے۔ سلطنت کے کام کاج میں فارسی اور عوامی رابطے کے لیے دہلی اور اس کے مضافات میں آزمائی ہوئی زبان اردو موجود تھی۔ دکن کو پنجاب اور دہلی کے بعد اردو کی تشکیل کی تیسری تجربہ گاہ ماننا چاہیے۔ جہاں مختلف ڈراوِری زبانوں سے علاحدہ شمال کی یہ زبان بہت تیزی سے اپنی ترقی کی منزلیں سر کرتی دکھائی دیتی ہے۔

ایک عرصہ تک خواجہ بندہ نواز گیسودراز کی تصنیف ''معراج العاشقین'' کو اردو کا پہلا کارنامہ مانا جاتا تھا۔ بندہ نواز کی موت 1421 میں ہوئی، اس لیے ظاہر ہے کہ یہ تصنیف اس سے قبل کی ہونی چاہیے لیکن بعض محققین نے اپنی تحقیق سے یہ ثابت کیا کہ جو کتاب خواجہ بندہ نواز سے منسوب کی جاتی ہے، وہ اصل میں ان سے کم سے کم 200 برس بعد کی ہے۔ ڈاکٹر حفیظ قتیل اور ڈاکٹر حسینی شاہد نے ''معراج العاشقین'' کو لسانی بنیادوں پر تول کر یہ فیصلہ حتمی کر دیا ہے کہ ''معراج العاشقین'' کی قدامت مشتبہ ہے اور اس کا کسی بھی اعتبار سے خواجہ بندہ نواز سے تعلق نہیں ہے۔ اسی زمانے کے ایک اور صوفی شیخ عین الدین گنج العلم جن کی وفات 1392 میں ہوئی، ان کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ ''رشد و ہدایت'' کے مرحلے میں مقامی زبان کا استعمال کرتے تھے۔ لیکن ان کی کسی تحریر کا اب تک پتہ نہیں چلا۔

سرزمین دکن سے جو پہلی کتاب دستیاب ہوئی ہے، وہ بہمنی سلطنت کے نویں بادشاہ ولی بہمنی کے دورِ حکومت

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime

Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

1434-1421 میں لکھی گئی فخر دین نظامی کی مثنوی ''کدم راو پدم راؤ'' کو جمیل جالبی نے غایت جاں فشانی کے بعد مثنوی کے مخطوطے کے عکس کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔ یہ عام عشقیہ کہانی دکن کے مخصوص ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔ اسی دور میں شاہ میراں جی شمس العشاق (وفات 1496) نے تصوّف کے موضوع پر بعض رسائل اور نظمیں لکھیں۔ ''شہادت الحقیقت'' اور ''خوش نامہ'' ان کی ایسی تخلیقات ہیں جن میں ہندی بحور کا استعمال کیا گیا ہے۔ سیّد شاہ اشرف بیابانی نے چودھویں صدی کی ابتدا میں ''نوسرہار'' جیسی مثنوی لکھی۔ یہ تخلیق ہے تو مرثیہ لیکن ہیئت مثنوی کی ہے۔ اسی دور میں خواجہ بندہ نواز کے پوتے سیّد عبداللہ حسینی نے ''نشاط العشق'' کا دکنی میں ترجمہ کیا۔

بہمنی سلطنت یوں تو 1527 تک کسی نہ کسی شکل میں قائم رہی لیکن پندرھویں صدی کے آخر سے ہی علاقۂ دکن پانچ خود مختار سلطنتوں میں بٹتا دکھائی دیتا ہے۔ برید شاہی اور عماد شاہی حکومتیں 1487 سے ہی بیدر اور برار میں قائم ہو جاتی ہیں۔ 1490 سے نظام شاہی اور عادل شاہی سلطنتیں احمد نگر اور بیجا پور میں برسرِ اقتدار ہو جاتی ہیں۔ 1512 میں گول کنڈہ میں قطب شاہی حکومت بنتی ہے۔ ان تمام حکومتوں کا اورنگ زیب کے فتح دکن کے قبل تک وجود قائم رہتا ہے۔ اردو کی ادبی تاریخ سے ان کا ان معنوں میں گہرا رشتہ ہے کہ سترھویں صدی تک اسی علاقے میں اردو کے شعرا اور ادبا پیدا ہوئے۔ ایک اور بات یہ کہ عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں نے اس نئی زبان کے فروغ کے لیے اپنی حکومت کی جو دریا دلی دکھائی، وہ تاریخ کے صفحات کا ایسا زرّیں باب ہے جس کی قوّت کے بغیر آج اردو کا کارواں ترقّی کی منزلوں تک نہیں پہنچ پاتا۔

گول کنڈہ اور بیجاپور سولھویں صدی اور سترھویں صدی میں اردو کے دو ایسے مراکز ہیں جن کی خدمات بہت ہیں۔ آج یہ سوچ کر تعجب ہوتا ہے کہ ان بادشاہوں نے اس نئی نویلی زبان کے لیے آخر کیوں اتنی سرگرمی دکھائی۔ جب کہ ان کے پاس فارسی جیسی مسلّمہ زبان موجود تھی جس میں طویل مدّت سے شعر و ادب کا ذخیرہ جمع ہو رہا تھا۔ یہی زمانہ ہے جب ہندستان میں مغلوں نے اپنی حکومت کی بے پناہ توسیع کی۔ بابر سے لے کر اورنگ زیب تک مغلوں کی حکومت کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ ملک میں فارسی زبان کا بول بالا بڑھا۔ لیکن دکن کی جن دو ریاستوں نے مغلوں سے الگ راستہ اپنایا اور ایک تازہ وارد زبان اردو کو اپنی محبّت اور نصرت عطا کی، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ دونوں حکومتیں مغلوں سے الگ اپنے وجود کو استحکام دینا چاہتی ہوں گی۔ خاص طور سے ابراہیم عادل شاہ، علی عادل شاہ اور محمد قلی قطب شاہ کے دورِ حکومت کو سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ ان تینوں بادشاہوں نے فارسی کے بجائے اردو میں خود بھی شاعری کی۔

عادل شاہی دور میں ہمیں سب سے پہلے ''کتابِ نورس'' کا پتا چلتا ہے۔ یہ ابراہیم عادل شاہ کی تخلیق ہے۔ اسی دور میں دکن کا دوسرا بڑا شاعر نصرتی موجود ہے جس کی مثنویاں ''گلشن عشق'' اور ''علی نامہ'' اردو کی قدیم کتابوں میں اب بھی ممتاز تسلیم کی جاتی ہیں۔ نصرتی علی عادل شاہ ثانی کا درباری شاعر تھا اور فنِ قصیدہ گوئی میں عہدِ سودا سے پہلے وہ بلاشبہ سب سے بڑا شاعر ہوا۔ برہان الدین جانم کی ''کلمۃ الحقائق'' دکن کی پہلی نثری تخلیق ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف مثنویاں بھی تحریر کیں جن میں ''ارشاد نامہ'' اور ''وصیّت الہادی'' قابل ذکر ہیں۔ برہان الدین جانم ایک بزرگ صوفی تھے اور تصوّف کے موضوع پر ان کی

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

تصنیفات کو اہمیت حاصل ہے۔ ان کے صاحب زادے امین الدین اعلا نے بھی اپنی تعلیمات کے لیے اسی زبان کو آزمایا۔ ان کے رسائل ''کلمتہ الاسرار''، اور ''گنج مخفی'' دکنی نثر کی ابتدائی کتابوں میں لسانی ارتقا کا ایک اہم پڑاو ہیں۔

عادل شاہی حکومت ایک بڑے جغرافیائی علاقے میں تھی۔ اس وجہ سے صوفیا سے الگ عشقیہ شاعری کرنے والے بھی کم نہیں ہیں۔ رستمی نے 27 ہزار اشعار کی مثنوی ''خاور نامہ'' 1649 میں تخلیق کی۔ سیّد میراں ہاشمی کی ''یوسف زُلیخا'' مَلِک خوشنود کی ''جنت سنگار''، صنعتی کے ''قصۂ بے نظیر'' اور مرزا محمد مقیم مقیمی کی 'چندر بدن مہیار' حسن شوقی کی ''فتح نامہ نظام شاہ'' کے ساتھ عبدل کی ''ابراہیم نامہ'' ایسی تخلیقات ہیں جن پر غور کیے بغیر دکن میں اردو مثنوی اور قصیدے کا کس طرح ارتقا ہوا، یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا۔

دکنی ادب کے ارتقا میں قطب شاہی حکومت کا کارنامہ عظیم تر ہے۔ یوں تو اس حکومت کے آٹھ بادشاہ ہوئے لیکن اس کا پانچواں بادشاہ محمد قلی قطب شاہ ایک ایسی جادوئی شخصیت کا مالک ہے جس سے دکن میں شاعری اور نثر کے وہ کارنامے سامنے آئے جنھیں اردو کی ادبی تاریخ کے سرمایے میں اہم ترین مقام حاصل ہے۔ قلی قطب شاہ کے علاوہ اس کے بعد کے بھی تینوں بادشاہ محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ بھی باضابطہ شاعر تھے اور ان کے دواوین موجود ہیں۔ قلی قطب شاہ نے تو تقریباً 50 ہزار اشعار کہے۔ یہ مشہور ہے کہ وہ دربار میں شاعری میں گفتگو کرتا تھا۔ دکنی سلطنتوں میں قلی قطب شاہ کی حکومت کا دور 1580 سے 1611 سلطنت کی وسعت، جدید کاری، تعمیرات اور ادب و ثقافت کے شعبوں میں بے مثال ترقیات سے عبارت ہے۔ یہ اکبرِاعظم کا معاصر تھا۔ اس شخص نے ''مرا شہر عالم میں مشہور ہو'' کے خواب کے ساتھ 1591 میں حیدرآباد کی بنیاد ڈالی۔ قطب شاہ کی عشقیہ شاعری، وطن دوستی اور زبان و بیان کے ساتھ تہذیب و معاشرت میں میل جول کے جذبے کو فروغ دینا، ایسی خدمات ہیں جن کا جواب امیر خسرو کے علاوہ اردو کی ادبی تاریخ میں کوئی نہیں۔

ملاّ وجہی، قلی قطب شاہ کا درباری شاعر تھا۔ ادبی اعتبار سے ارضِ دکن سے اگر دو اہم کتابوں کا انتخاب کرنا ہو تو وہ دونوں کتابیں قطب مشتری اور سب رس ہوں گی۔ محمد قلی قطب شاہ کی محبت کی داستان لکھتے ہوئے ملاّ وجہی نے 1609 میں وہ عظیم مثنوی رقم کی جس سے اب باضابطہ مثنوی کی تاریخ شروع کی جاتی ہے۔ وجہی نے تین بادشاہوں کا دور دیکھا: محمد قلی، محمد قطب اور عبداللہ قطب شاہ۔ اس کی بدنصیبی یہ تھی کہ اصل عروج کے وقت اس کا محسن قلی قطب شاہ گزر گیا۔ عبداللہ قطب شاہ کو شعر و ادب سے دلچسپی تو تھی لیکن اس کے دربار میں وجہی کا سب سے بڑا حریف غوّاصی موجود تھا۔ اس لیے اس مرتبہ وجہی نے اپنی صلاحیت کے جواہر ریزے نثر میں بکھیرنے کا منصوبہ بنایا اور قصۂ حسن و دل کو 1635 میں ''سب رس'' کے نام سے پیش کر دیا۔ یہ دکن میں اردو کی ادبی نثر کا پہلا نمونہ ہے۔ اس سے پہلے نثری تعلیمات تصوف اور مذہبیات سے متعلّق تھیں۔ ''سب رس'' اپنی بے مثال نثر نگاری اور قصہ گوئی کی خوبیوں کی وجہ سے اب بھی اردو نثر کی بہترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

قطب شاہی دور میں وجہی کے علاوہ دو بڑے شاعر دکھائی دیتے ہیں۔ غواصی اور ابن نشاطی۔ غواصی کی دو مثنویاں ''سیف الملوک و بدیع الجمال'' اور ''طوطی نامہ'' دکن کی بڑی کتابوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ابن نشاطی نے 1655 میں ''پھول

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

بن‘‘ کی تخلیق کی۔ ان کے علاوہ قطب شاہی دور میں فیروز، محمود، ملّا خیالی، جنیدی، میراں جی یعقوب اور سید بلاقی ایسے شعرا ہیں جن کی تخلیقات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن قلی قطب شاہ کے بعد فرماں رواؤں میں کوئی ایسا دکھائی نہیں دیتا جس نے بڑے پیمانے پر علم و ادب کی توسیع کے لیے اپنی حکومت کا خزانہ کھول دیا ہو۔ اس لیے دکنی ریاستوں کے زوال کے پہلے سے ہی شعر و ادب کی بزم میں ایک انتشار کا ماحول ہے۔ برید شاہی، عماد شاہی اور نظام شاہی حکومتیں تو سترھویں صدی کے نصف سے پہلے ہی اختتام پذیر ہو چکی تھیں لیکن اورنگ زیب کے دکن کو فتح کرنے اور عادل شاہی اور قطب شاہی حکومتوں کو 1686 اور 1687 میں زیر کر لینے سے پہلے دکنی شعر و ادب کی وہ آخری نسل ہمارے سامنے آچکی تھی جس کی قیادت بجا طور پر ولی کر رہے تھے۔

سترھویں صدی کے آخری زمانے میں بحری، وجدی، ذوقی اور فراقی جیسے شعرا بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن ولی کے زور کے سامنے ان میں سے کسی کا وجود معنی نہیں رکھتا۔ ولی، دکن، اورنگ آباد یا گجرات میں کہاں پیدا ہوئے، یہ ادبی تاریخ نویسی کی ایک عجیب گتھی ہے لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ دکنی ادب کی تین صدیوں کے ارتقا کی وہ سب سے مضبوط اور روشن کڑی کے طور پر ایک نمائندہ کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ آخر ولی کی زبان میں مقامیت یا دکنیت کم نہیں ہو چکی ہوتی اور لسانی تجربوں کی ایک منزل نہیں آچکی ہوتی تو یہ بھلا کیسے ممکن ہوتا کہ 1700 میں دہلی آمد کے ساتھ شمالی ہندستان میں انقلاب برپا ہو گیا۔ ولی کی شاعری اصحاب دہلی کے لیے ایک ایسے طوفان کی طرح تھی جس نے انھیں نئے انداز و اطوار کے ساتھ پھر سے زندگی شروع کرنے کا راستہ دکھایا۔ یہ مانا جائے کہ ولی کی نگرانی میں ہی اٹھارھویں صدی کے آغاز میں اردو کا نیا لسانی مزاج تیار ہوا۔ جس کے بہترین قائد محمد تقی میر تسلیم کیے گئے۔ دکن کے دورِ آخر کے شاعروں میں سراج اورنگ آبادی کی اہمیت مسلّم ہے۔ سراج نے 24 برس کی عمر میں شعر گوئی ترک کر دی۔ اس کے باوجود عشق و مستی کے ساتھ متصوفانہ خیالات کی پیش کش اس کا بڑا کارنامہ ہے جس کے اثرات دہلی پر بھی پڑے۔

اس تفصیلی گوشوارے سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ پندرھویں سے سترھویں صدی تک اردو کے ارتقا اور ادبی زبان کے طور پر اس کے ابھرنے کا سارا کارنامہ اہلِ دکن کا ہے۔ اہلِ دکن کثیر لسانی ماحول میں پرورش پانے والے لوگ تھے۔ تہذیبی اعتبار سے بھی ان میں الگ الگ انداز و اطوار دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے یہاں عشق و مستی کے ساتھ تصوّف بھی ایک سماجی کیفیت ہے۔ اردو شعر و ادب اگر آج بھی معاشرتی ہمہ جہتی اور ہم آہنگی کا پاسدار ہے تو کہنا چاہیے کہ یہ بھی اہلِ دکن کا خاص اثر ہے لیکن محمد بن تغلق کے دہلی سے دکن جانے اور ولی کے دہلی آجانے سے ایک ادبی دائرہ (cycle) مکمل ہو جاتا ہے۔

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
© Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

مختصر گفتگو

۱۔ اردو وارضِ دکن تک کیسے پہنچی؟

۲۔ بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد وجود میں آنے والی ریاستوں کے نام لکھیے۔

۳۔ عادل شاہی دور کی یادگار تین مثنویوں کے نام مع تخلیق کار درج کیجیے۔

۴۔ غوّاصی اور ابنِ نشاطی کی کتابوں کے نام لکھیں۔

۵۔ ملّا وجہی کی شاعری پر ایک نوٹ لکھیے۔

۶۔ دکن کے شاعر بادشاہوں کی فہرست تیار کیجیے۔

تفصیلی گفتگو

۱۔ ''معراج العاشقین اردو کا پہلا کارنامہ نہیں ہے۔'' واضح کیجیے۔

۲۔ بہمنی دور کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

۳۔ دکنی مثنویوں کا مختصر جائزہ لیجیے۔

۴۔ محمد قلی قطب شاہ کی شاعرانہ خدمات پر تبصرہ کیجیے۔

۵۔ ولی کی غزل گوئی کے امتیازات واضح کیجیے۔

۶۔ 'اردو شمال میں پیدا ہوئی لیکن اس نے ترقی کی ابتدائی منزلیں دکن میں طے کیں، اس قول سے آپ کو کس حد تک اتفاق ہے؟

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime

Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

دہلی اور لکھنؤ میں شعر و ادب کا ارتقا

اردو دکن میں ایک اچھی خاصی مدّت تک پھلنے پھولنے اور ارتقا کے راستے طے کرتی ہوئی پھر سے جب اٹھارھویں صدی کے آغاز میں دہلی میں رونق افروز ہوئی، اس وقت دہلی میں فارسی گویوں کا بول بالا تھا۔ ہندستان ہی نہیں، افغانستان اور ایران تک کے معروف فارسی شعرا ہندستان کی سرزمین پر دادِ سخن دے رہے تھے۔ اس دور میں اردو اہلِ دہلی کے درمیان کہاں ہے، اس کی تلاش کے لیے تین اجزا بے حد اہم ہیں۔ (۱) دکنی شاعری کا دہلی پہنچنا (۲) فارسی گویوں کا اردو کی طرف ملتفت ہونا اور (۳) ایہام گو شعرا کا تیزی سے اُبھرنا۔ یہ واقعات ایک ہی وقت میں، ایک ہی جغرافیائی ماحول میں ہو رہے ہیں۔ یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ ان تینوں کے درمیان کوئی باہمی تعلّق ہے یا نہیں۔ قرائن واضح کرتے ہیں کہ ان کے بیچ کوئی رشتہ ہو سکتا ہے۔ تاریخِ ادب کے طالب علم کو ان معاملات پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

عہدِ محمد شاہ میں سراج الدین علی خاں آرزوؔ اور مرزا عبدالقادر بیدلؔ فارسی کے دو ایسے بڑے شاعر موجود ہیں جن کی اردو گوئی ثابت ہے۔ شاہ جہاں کے دور تک ابوالفضل، فیضی، عرفی، نظیری، صائب، قدسی اور کلیم جیسے شعرا دربار سے وابستہ تھے اور مغلیہ سلطنت کے عروج کے ساتھ ان کی فارسی گوئی بھی تیزی سے پروان چڑھ رہی تھی لیکن اورنگ زیب کے وصال کے ساتھ فارسی کا زور گھٹنے لگا، یہی زمانہ ہے جب دہلی میں اس عوامی زبان کی طرف جھکاو بڑھا۔ جس کی واضح مثال آرزوؔ اور بیدلؔ ہیں۔ جن کے پاس ایسے شاگرد موجود تھے جو اردو گوئی کی طرف آنا چاہتے تھے۔ دہلی میں اردو شعرا کی پہلی نسل واقعتاً انھیں فارسی گو اساتذہ کی آغوشِ تربیت میں پلی ہوئی ہے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں دہلی میں جن شعرا پر ہماری سب سے پہلے نظر پڑتی ہے، اُن میں صفِ اوّل ایہام گو شعرا کی ہے۔ فارسی گوئی سے الگ ہونے کا یہ ایک لسانی حربہ بھی ہے۔ شاید ان پر ولیؔ سے متاثر ہونے اور اس کا بھونڈے طور پر استعمال کرنے کا بھی الزام عائد ہوا لیکن وہ شاعری کو ایک لسانی کھیل تماشا بنا کر اس کے وسیلے سے اپنے عہد کی بوالعجبیوں کو پیش کر رہے تھے۔ فائز، آبرو، ناجی، یک رنگ، مضمون، فغان، تاباں جیسے ایہام گو شعرا میں وہ قوّت ضرور ہے جس سے نئی نسل متاثر ہو رہی تھی۔ ایہام گویوں کے یہاں معاشرتی زوال کے اثرات سب سے زیادہ ہیں۔ ہند مغل تہذیب جس بڑے پیمانے پر شکست و ریخت کا شکار ہو رہی تھی، اس دور کے شعرا اس سے الگ کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ بولیوں کے وہ شعرا جو گذشتہ دور میں بھگتی تحریک کے زیرِ اثر ملک کے طول و عرض میں پھیل چکے تھے، اب اس کو کائی تازہ سلسلہ دہلی میں موجود نہیں تھا۔

تاریخ کے اس موڑ پر دہلی کی شاعری کی سب سے طاقتور نسل سامنے آتی ہے۔ ناقدین نے اسی زمانے کو اردو کا

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

عہدِ زرّیں قرار دیا ہے۔ اس نسل کے پہلے دستے میں ایہام گویوں کی بزم سے ابھرے شاہ حاتم اور مرزا مظہر اور اُن کے دوسرے شاگرد ہیں جنھوں نے اصلاح زبان کی تحریک کی داغ بیل رکھ کر ایک ایسا نیا سلسلہ چلایا جس سے ایہام گوئی دہلی سے تمام ہوگئی۔ اسی قبیل میں انعام اللہ خان یقین جیسے نوجوان شاعر بھی شمار کیا جاسکتا ہے۔ لیکن درد، میر، سودا، سوز اور میر اثر جیسے شاعروں کی نسل نے دہلی میں اردو شاعری کے کارواں کو بہت وسعت اور بلندی بخشی۔ نظیر اکبر آبادی الگ سے دہلی میں اردو شاعری کے ماحول کو نیا ذائقہ بخش رہے تھے۔

اردو شاعری کے اس عہدِ زرّیں کو سیاست اور سماج کی طرف سے کوئی تعاون نہیں تھا۔ سلطنتِ دہلی کے فرمارواں معذور و مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ اٹھارویں صدی میں آخری نصف تو شاہ عالم ثانی کا دور ہے جس کی بادشاہت کا علاقہ ''از دہلی تا پالم'' قرار دے کر لوگ مذاق اُڑاتے تھے۔ ایسے میں اردو شاعروں اور ادیبوں کو حکومت سے کوئی معاونت نہیں مل رہی تھی۔ میرؔ کی زندگی کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ لکھنؤ پہنچنے سے پہلے وہ دہلی اور اس کے مضافات میں مالی پریشانیوں کو دور کرنے کے مقصد سے کم از کم 25 سفر کر چکے ہیں۔ اسی مرحلے میں لکھنؤ کے نوابین سامنے آئے ہیں۔ خاص طور پر شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے زمانے میں فیض آباد اور پھر لکھنؤ اردو داں حلقے کے لیے ایک پرکشش مرکز بن جاتے ہیں۔ تلاشِ معاش میں شاعروں اور ادیبوں کو جائے اماں چاہیے اور اسی لیے دہلی سے بڑی تعداد میں لکھنے والے اودھ کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے اودھ کی راہ لینے والے پہلے قابل ذکر شاعر فغاں ہیں۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں ہی سوداؔ اور جعفر علی خاں حسرت جیسے شاعر بھی فیض آباد پہنچ جاتے ہیں۔ میر ضاحک بھی سب سے پہلے اودھ آنے والوں میں گنے جاتے ہیں۔ آصف الدولہ کے زمانے میں 1781 سے 1782 تک میرؔ بھی تلاشِ معاش میں لکھنؤ پہنچ چکے ہیں۔ انشا اللہ خاں انشاؔ، مصحفیؔ اور میر حسن سب دہلی سے لکھنؤ میں موجود ہیں۔ لکھنؤ میں اردو شاعری کا پہلا دور انھیں دہلوی تارکینِ وطن سے قائم ہوتا ہے۔ تاریخ میں ہمارے پاس زیادہ اطلاع نہیں کہ اُن شاعروں سے پہلے لکھنؤ میں اردو کی کون سی سرگرمیاں تھی۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ان میں سے اکثر شعرا لکھنؤ بڑھاپے میں آئے۔ اس کی وجہ سے اُن کی شاعری ایک خاص مقام تک پہنچ کر لسانی اور ادبی مزاج میں پختگی حاصل کر چکی تھی۔

لکھنؤی شاعری کا واقعتاً دورِ دوم عروج سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس میں کم عمر کی دہلوی نسل تو ہے ہی، بعض ایسے شاعر بھی ہیں جو دہلی کے عمومی مزاج سے الگ اپنا انداز رکھتے تھے۔ جرأتؔ، انشاؔ، مصحفیؔ اور میر حسنؔ ایسے شاعروں میں اوّلیت رکھتے ہیں جن سے لکھنؤ میں علاحدہ قسم کے شعری اسلوب کی بنیاد پڑی۔ جرأتؔ بیان کی رنگینی اور معاملہ بندی اور میر حسنؔ تہذیب کی پاسداری کی وجہ سے لکھنؤ میں دو علاحدہ انداز کی بنیاد رکھنے والے فن کار قرار پائے۔

اٹھارویں صدی کے درمیانی عہد کو نظر میں رکھیں تو ناسخؔ اور آتشؔ کی اہمیت سمجھ میں آتی ہے۔ ناسخؔ، مصحفیؔ کے شاگرد ہیں، لیکن انھوں نے اپنے شاگردوں خاص کر میر اوسط علی رشکؔ کے ذریعہ زبان کی ایک علاحدہ معیار سازی کی کوشش کی۔ لکھنؤ کے یہ دونوں اساتذہ حلقۂ شاگرداں کے معاملے میں بے حد خوش نصیب ہیں۔ ان لوگوں نے دہلی سے الگ زبان کے سانچے کو

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

تیار کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ آتشؔ کے شاگردوں میں دیا شنکر نسیم کی مثنوی "گلزارِ نسیم" کے علاوہ کوئی بڑا کارنامہ دکھائی نہیں دیتا۔ ناسخؔ اور اُن کے شاگردوں نے قواعد اور قوانین پر جتنا وقت لگایا، اس کے حساب سے تخلیقات کے تئیں اُن کی توجہ نہیں رہی۔

اسی زمانے میں لکھنؤ میں مرثیوں کا بھی بڑا فروغ ہوا۔ میر ضمیرؔ اور خلیقؔ نے جس چراغ کو روشن کیا تھا، اسے ان کے بعد کی نسل نے آفتاب بنا دیا۔ انیسؔ اور دبیرؔ کا دور اردو شاعری کی تاریخ کا ایک اہم موڑ ہے۔ لکھنؤ میں مثنویوں کے ساتھ ساتھ جس طرح مرثیوں کا فروغ ہوا، وہ اردو شاعری کا علاحدہ باب ہے۔ دہلی کی بزم میں اردو نثر کی طرف کم توجہی تھی، لیکن اہالیان لکھنؤ نے داستان نویسی کو آزمانے کی کوشش کی۔ (نوطرز مرصع) عطا حسین خاں تحسین، (فسانہ عجائب)، (شرارِ عشق) اور (شگوفۂ محبت) رجب علی بیگ سرور اور (بستانِ حکمت) فقیر محمد گویا اسی عہد کے اہم قصہ گو ہیں۔ (رانی کیتکی کی کہانی) اور (دریائے لطافت) بھی انشا اللہ خاں انشا اسی خاک سے برآمد ہوئیں۔ فورٹ ولیم کالج کے کئی مصنفین میر شیر علی افسوس اور مرزا علی لطف لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔

اردو کی ادبی تاریخ میں پرانی تنقید کے حوالے سے دہلی اور لکھنؤ کے مراکز کے زیرِ اثر لکھے گئے ادب کو بعض اوقات ایک دوسرے کے مقابلے کھڑا کیا گیا اور اسی سے دبستانی اختلافات کا فروغ ہوا۔ رفتہ رفتہ ان اختلافات نے ایسی بنیادی شکل اختیار کرلی جس میں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کا ایک ضد بھی شامل تھی۔ یہ زخم ایسا ناسور بنا کہ دہلی اور لکھنؤ کی اردو کو بالکل الگ قسم کا تسلیم کیا جانے لگا یا کم سے کم یہ کوشش ضرور ہوئی کہ دونوں مقامات کی تخلیقات میں بہت زیادہ فرق ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دہلی کی طرح شعر و ادب کی کوئی طویل روایت لکھنؤ میں موجود نہیں تھی۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر سے پہلے لکھنؤ کی ادبی تاریخ میں کوئی بڑی تخلیقی شخصیت دکھائی نہیں دیتی لیکن دہلی کی اُجڑتی بزم کے سامنے لکھنؤ کی چمکتی فضاؤں کی اہمیت زیادہ ہوگئی تھی۔ اسی لیے اہل لکھنؤ کے ذہن میں کہیں یہ بات آئی کہ جب ہوا کا رخ ہماری طرف ہے تو کیوں نہ خود کو تاریخ کا ایک علاحدہ باب قرار دے دیا جائے۔ یہ سلسلہ رجب علی بیگ سرور سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اس جذبۂ تفاخر کو غیر فطری کہنا، انصاف کا تقاضہ نہیں ہے اور اسی طرح دبستانِ لکھنؤ کا آزادانہ وجود قائم ہوا۔

اہلِ لکھنؤ نے دہلی اور لکھنؤ کے شاعروں کے کلام سے زبان و بیان کے استعمال کے بعض امتیازات کی تشہیر کی۔ زیرِ بحث بیش تر معاملے ضمنی رہے۔ بعض الفاظ جس پر اہل دہلی جنسیت کے تعلّق سے بحث کرتے تھے اور مذکر یا مؤنث دونوں طور پر استعمال کرتے تھے۔ انھیں لکھنؤ والوں نے اس طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی جن پر اہلِ دہلی کی اکثریت کاربند نہیں تھی۔ ایسے الفاظ کی فہرست قدرے طویل ہے۔ مثلاً بلبل، طرز، سانس، رتھ۔ اسی طرح تلفّظ کے معاملے میں بھی دہلی سے بالارادہ الگ انداز اپنانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ تمام الفاظ ویسے ہی تھے جو اہلِ دہلی کے یہاں بھی دونوں طرح سے استعمال ہوتے تھے۔ اس طرح کہنا چاہیے کہ لفظوں کی سطح پر لکھنؤ اور دہلی کے جس فرق کو بڑھا چڑھا کر دکھایا گیا، وہ یقیناً ویسا نہیں تھا۔

ناسخؔ اور اُن کے شاگردوں نے لکھنؤ میں اصلاح زبان کا کام اپنے ہاتھوں میں لیا اور اردو میں متروکات کی ایک طویل فہرست جاری کی۔ ہندوی سے گریز اور فارسیت کی طرف استناد کے لیے دوڑنا، لکھنؤ کی اس نئی زبان کا طرۂ امتیاز تھا۔ بلاشبہ لکھنؤ

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

کے حلقے میں یہ زبان نافذ ہوئی۔ لیکن اس بات کو دہلی سے جس طرح مخالف سمت کا معاملہ سمجھا جاتا ہے، ویسا ہرگز نہیں ہے۔ ناسخ سے تین چوتھائی صدی پہلے دہلی میں مرزا مظہر جانِ جاناں اور ان کے شاگردوں نے جو ایہام گویوں کے خلاف تحریک چلائی، اس کے اغراض و مقاصد بھی ہندوی سے گریز اور فارسیت کی طرف جھکاو سے الگ کیسے تھے؟ دہلی میں بھی متروکات کی ایک فہرست جاری کی گئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لکھنؤ اور دہلی دونوں جگہ ایک ہی طرح کی اصلاح زبان کی تحریک چلی۔ اتفاق سے دونوں کے نتائج یکساں رہے۔ ان کے بعد کی نسلوں نے اس لسانی منشور (Linguistic Manifesto) پر کچھ خاص توجہ نہ دی اور اسی وجہ سے ان دونوں اصلاحِ زبان کی تحریکوں سے کوئی قد آور ادبی شخصیت نہیں پیدا ہوئی۔ میر اور سودا، مرزا مظہر جان جاناں سے الگ رہے، اور آتش یا دیا شنکر نسیم حلقۂ ناسخ سے علاحدہ ہے۔

لکھنؤ اور دہلی کی شاعری میں ایک اور بنیادی فرق داخلیت اور خارجیت کو بتایا جاتا ہے۔ عمومیت پسند قدیم ناقدین نے بتایا کہ دہلی کی شاعری میں داخلیت ہے اور لکھنؤ کی شاعری میں خارجیت ہے۔ اس کی ایک اور وجہ یہ بھی معلوم ہے کہ دہلی کی فضاؤں میں اہلِ تصوف کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس کے برخلاف لکھنؤ کے ماحول میں عیش پسندی اور تصنّعات کی فراوانی تھی۔ دونوں دبستانوں کی شاعری میں بالعموم یہ فرق ہے۔ لیکن دونوں جگہ کے اچھے شاعروں میں فرق کی دوری کم سے کم ہے۔ یوں بھی خارجیت اور داخلیت کو جتنی آسانی سے بلکہ الگ الگ مان لیا جاتا ہے، واقعتاً ان کا اس طرح علاحدہ وجود ہوتا نہیں۔ داخل اور خارج کا ایک گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ لکھنؤ کے شعرا نے بھی جن پر خارجیت کی تہمت ہے، عشق و عاشقی کے گہرے تجربے بیان کیے ہیں۔ آتش کی مثال سامنے ہے جنھیں داخلیت ہی نہیں، متصوفانہ گھنی چھاؤں بھی پسند آتی ہے لیکن اسی کے مقابلے دہلی میں تمام ایہام گو اور اُن سے پہلے جعفر زٹلی کس چیز کے شیدا تھے؟ ایسے ہی خارجیت اور داخلیت کو بنیادی خصوصیت مانتے ہوئے لکھنؤ اور دہلی اسکولوں کو کیسے الگ الگ کیا جاسکتا ہے؟ جس شاعر کی نگاہ جتنی گہری ہوگی، وہ اسی قدر موضوع کے تن بدن میں اندر تک جائے گا۔ یہی خارج یا ظاہر سے داخل اور باطن کا سفر ہے اور اس میں دہلی اور لکھنؤ کے درمیان آخر کیوں فرق ہونا چاہیے؟

شعر و ادب سماجی اور سیاسی ماحول کی عکّاسی کرتے ہیں۔ وہ اپنے عہد کا نبض پیما ہوتے ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین، دہلی اور لکھنؤ دبستان کے فرق کو نہیں مانتے۔ ان کی توضیح ہے کہ جب دونوں کا معاشی اور سیاسی ماحول بہت بدلا ہوا نہیں تھا تو کیسے ان جگہوں کے ادب میں کوئی بنیادی فرق آجائے گا۔ دونوں زوال کی پرچھائیوں میں قید ہیں اور ان سے نجات کہیں نہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں بعض شعرا اور ناقدین نے لکھنؤ اور دہلی کے شعر و ادب میں دوریاں ڈھونڈنے کا منصوبہ بند کام کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب اس تنازعے کو سنجیدگی سے دیکھنے کی روش عام ہوئی، تب دونوں دبستانوں کے نقطۂ اتصال کی تلاش شروع ہوئی۔ احتشام حسین کی بات اس وجہ سے معنی رکھتی ہے کیونکہ وہ خود اسی لکھنؤ کی خاک سے اُٹھے تھے۔ حلقۂ لکھنؤ کے ایک اور فرزند علی جواد زیدی نے ''دو ادبی اسکول'' کتاب لکھ کر سیکڑوں مثالیں فراہم کیں اور کہا کہ یہ ''نام نہاد'' اسکول ہیں اور دہلی سے لکھنؤ کے بیچ ادبی دوری اتنی کبھی نہیں رہی جس قدر وہ دکھائی جاتی ہے۔ یہ ماننا سب سے زیادہ صحیح ہوگا کہ دہلی اور لکھنؤ تاریخِ ادب کے دو پڑاو ہیں لیکن ادب کا سلسلۂ خیال اس سے پہلے سے بھی چلتا رہا ہے اور اس کے بعد بھی چلتا رہے

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

گا۔ دو مقامات اور تاریخوں کے درمیان جو فرق ہوتے ہیں، وہ بنیادی نوعیت کے کم ہوتے ہیں۔ انفرادی معاملے میں فرق فطری ہے۔ لکھنؤ اور دہلی دبستانوں کا تنازعہ اسی نقطۂ نظر سے حل کیا جا سکتا ہے۔

مختصر گفتگو

۱۔ دہلی میں اردو شعرا کی پہلی نسل کن فارسی گو اساتذہ کی آغوش میں پلی؟

۲۔ وہ کون سے ایہام گو شعرا ہیں جن سے نئی نسل متاثر ہو رہی تھی اور کیوں؟

۳۔ اٹھارویں صدی کی اہم مثنویوں اور مثنوی نگاروں کی فہرست بنائیے؟

۴۔ لکھنؤ کی اہم نثری تصانیف اور ان کے مصنّفین کے نام بتائیے؟

۵۔ اردو شاعری کا عہدِ زرّیں کس عہد کو کہا جاتا ہے اور کیوں؟

تفصیلی گفتگو

۱۔ لکھنؤ اور دہلی کی شاعری میں بنیادی فرق کیا ہے؟

۲۔ دہلی میں شعر و ادب کے ارتقا پر ایک تبصرہ کیجیے۔

۳۔ لکھنؤ میں شعر و ادب کے ارتقا کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیجیے۔

۴۔ ادبی اسکول سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ لکھیے۔

۵۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے پانچ پانچ شعرا کے نام لکھیے اور ان کے بارے میں دو دو جملے لکھیے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

عظیم آباد کی ادبی سرگرمیاں

اردو کی ابتدا سے متعلق تحقیقات میں مختلف طرح کی پیچیدگیاں ہیں لیکن دہلی اور لکھنؤ شعروادب کے دو بنیادی مراکز میں، اس سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔ اردو ادب کے ارتقا کا سفر یہ ثابت کرتا ہے کہ ان دونوں مقامات میں یہ زبان خوب پھلی پھولی۔ تاریخی طور پر دکن کو بھی دبستان ماننا اس لیے موزوں ہے کیوں کہ اس علاقہ میں اردو نہ صرف ابتدائی دور میں ترقی پاسکی بلکہ ملاّ وجہی، قلی قطب شاہ، نصرتی، ولی، سراج جیسے شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جنھیں اردو کی ادبی تاریخ میں اہمیت حاصل ہے۔ اِن تین ادبی مراکز کی بنیاد پر اردو قومی سطح کی زبان نہیں بن سکتی تھی۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ قطب شاہی اور عادل شاہی، مغلیہ اور نوابین اودھ کی سلطنتوں نے اردو زبان اور ادب کی پرورش و پرداخت میں جتنی بھی مشقت کی ہو لیکن صرف انھیں کے بل بوتے پر اردو کو قومی زبان نہیں بننا تھا۔

عظیم آباد، رام پور، آگرہ اور مرشدآباد ایسے ادبی مراکز ہیں جنھیں دکن، دہلی اور لکھنؤ کے بعد دوسری صف میں رکھا جا سکتا ہے۔ مرکزی حکومت کے بکھراو اور زوال کے ساتھ کچھ اس طرح کے خود مختار ادارے اور مراکز اپنے آپ قائم ہو جاتے ہیں۔ کسی بڑھنے اور پھیلنے والی زبان کے لیے یہ ناگزیر ہوتا ہے کہ وہ مراکز سے دور آبادیوں تک جائے۔ دہلی اور لکھنؤ سے دور اردو کے یہ مراکز اس زبان کی توسیع کا ایک حصّہ ہیں۔ عظیم آباد کو یہ سہولت حاصل رہی کہ وہ لکھنؤ اور مرشدآباد کے بیچ میں آباد ہے اور دہلی کے طرح ہی اہلِ تصوّف کا کئی صدیوں سے گہوارہ رہا ہے۔

جب اردو ایک زبان کے طور پر نہیں ابھری تھی اور آدھے ادھورے جملے یا چند الفاظ تک اس کی بساط تھی، اس عہد کا تذکرہ مولوی عبدالحق کی کتاب ''اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیاے کرام کا حصّہ'' میں درج ہے، شرف الدین یحیٰ منیری کے ملفوظات کا حوالہ دیتے ہوئے مولوی عبدالحق نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ آٹھویں صدی ہجری تک اس علاقہ میں اردو استعمال میں آنے والی زبان بن چکی تھی۔ ظہورالدین ظہور، محمد تقی بلخی شاہ، عطا حسین منعمی، سیّد محمد اسحاق جیسے صوفیہ کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا جن کی خدمات اردو زبان وادب سے متعلق رہی ہیں۔ انھیں کی بدولت بہار میں دورِ اوّل میں اردو کا فروغ ممکن ہوسکا۔ عظیم آباد کے دبستان بننے کے کئی اسباب ہیں۔ یہ علاقہ کئی صدیوں سے علما، شعرا و ادبا کا مرکز رہا ہے۔ سیّد حسن عسکری نے بہار کے ان سیکڑوں صوفیا کی تلاش میں کامیابی پائی ہے جو آٹھویں نویں صدی عیسوی سے لے کر مغلوں کے زمانے تک بہار میں مختلف مقامات پر دکھائی دیتے ہیں۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

حاجی پور میں قاسم حاجی پوری، راج محل کے پہاڑی علاقے میں مرزا عبدالقادر بیدل جیسے شعرا کا موجود ہونا یہ واضح کرتا ہے کہ اس زمانے میں فارسی گوئی بہار کے گوشے گوشے میں ایک حقیقت تھی۔ صوفیا کی تعلیم اور فارسی شاعروں اور ادیبوں کی تربیت نے ہی بہار میں اردو کے لیے ایک ایسا ماحول تیار کر دیا کہ دہلی اور لکھنؤ کے بعد عظیم آباد ادبی دبستان کے طور پر اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔

عظیم آباد کس طرح دبستان بنا، اس کی ایک مثال اردو کی ممتاز داستان 'باغ و بہار' کے مصنف میر امن کی زندگی میں پوشیدہ ہے۔ میر امن دہلی والے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ دلّی کے اجڑنے کے بعد وہ لکھنؤ پہنچے۔ پھر کئی برس عظیم آباد میں رہے۔ یہیں سے انھوں نے کلکتے کا رخ کیا اور فورٹ ولیم کالج کی نوکری پر معمور ہوئے۔ محققین نے تخمینا میر امن کی عظیم آباد میں رہائش کو 27۔26 برس بتایا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ میر امن کے ذاتی احوال کے متعلق خاموش ہے۔ اس لیے یہ بتانا تقریباً ناممکن ہے کہ میر امن اس دوران عظیم آباد میں کیا کر رہے تھے لیکن اس سچائی سے انکار کیسے کیا جائے کہ میر امن کی ادبی تربیت میں عظیم آباد کی ادبی محفلوں کا بھی حصّہ رہا ہے۔

پروفیسر اختر اورینوی اور مظفّر اقبال کی گراں قدر تحقیقات نے بہار میں اردو کی نشو و نما کے تعلّق سے اچھا خاصا مواد جمع کر دیا ہے۔ مذہبی اور علمی نثر، قدیم شاعری، ناول اور افسانہ، ان مختلف صورتوں میں اہلِ بہار کی فتوحاتِ علمی ان کتابوں سے اجاگر ہوتی ہے۔ اگر اٹھارھویں اور انیسویں صدی کو ہی بنیاد مانیں جب دبستانی فتوحات کو اہمیت حاصل تھی، اس زمانے میں جوشش، مرزا محمد فدوی، غلام علی راسخ عظیم آبادی، سجاد عظیم آبادی، شاہ آیت اللہ جوہری، عماد الدین پھلواروی، رام نارائن موزوں، دلدار، رضا عظیم آبادی، شورش، عشقی، علی ابراہیم خاں خلیل ایسے صاحبِ کمال موجود رہے ہیں۔ کسی ایک خطّے میں ایسا اجتماع یہ ثابت کرتا ہے کہ عظیم آباد اس دور میں علم و فن کا گہوارہ بن چکا تھا۔

غدر کے بعد جس طرح دلّی اور لکھنو میں انتشار کی فضا قائم ہوئی، اس مرحلے میں شہر عظیم آباد اردو کی ترقّی میں ایک جائے اماں بن کر ابھرا۔ دلّی کے ایسے کئی شعرا ہیں جنھیں عظیم آباد میں اس پیغمبری وقت میں قیام کرنے کا موقع ملا۔ اشرف علی خاں فغاں، مہاراجا کلیان سنگھ عاشق، مرزا محمد علی فدوی، شاہ رکن الدین عشق، محمد باقر حزیں اور میر ضیا جیسے اصحاب دہلی کے اجڑنے کے بعد عظیم آباد کی خاک میں ہی اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔ یہی وہ موقع تھا جب عظیم آباد نے اپنی انفرادی شناخت کا مقدمہ پیش کیا۔ 1846 میں جب شاد کی پیدائش ہوئی اور رفتہ رفتہ اُن کی شہرت لکھنؤ اور حیدر آباد تک پھیلنے لگی تو یہ موقع تھا کہ عظیم آباد کو دبستان کے طور پر پہچان ملے۔ حالاں کہ یہ دور دبستانی امتیازات کے ختم ہونے اور ملک گیر سطح پر اردو کے عمومی رجحان سے عبارت ہے۔ لیکن دلّی اور لکھنؤ کی مقابلہ آرائی میں عظیم آباد نے ایک متوازن اور بعض اوقات فیصلہ کن رویہ اپنایا۔ بعض ناقدین جس آسانی سے یہ بات کہہ لیتے ہیں کہ عظیم آباد دلّی اسکول کی توسیع ہے، شاید وہ اپنی بات جلد بازی میں کہتے ہیں۔

عظیم آباد کا ادبی اسکول اصل میں دلّی اور لکھنؤ کی ادبی اجارہ داریوں کے خلاف ایک توازن اور اعتدال کی طرف بڑھتا ہوا قدم تھا۔ چھوٹے چھوٹے مسئلوں پر اہلِ دلّی اور لکھنؤ جس طرح ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے، عظیم آباد نے اس کے

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

خلاف توازن کا ادبی پیمانہ وضع کیا۔ شاد عظیم آبادی اس ادبی رواداری کے نمایندہ بن کر ابھرے۔ آخر کوئی تو وجہ ہوگی کہ لکھنؤ اور حیدرآباد تک کی محفلِ مراثی میں شاد عظیم آبادی اہمیت کے ساتھ بلائے جاتے تھے۔ اور دبیر ایک زمانے تک عظیم آباد کی محفلوں میں مرثیہ پڑھنے کے لیے تشریف لاتے تھے۔ دبیر کے صاحب زادے مرزا صاحب اوج اور داغ دہلوی، داغ کے داماد سائل جیسے شعرا عظیم آباد کی طرف اس وجہ سے توجہ کر رہے تھے کیوں کہ وہ دلّی اور لکھنؤ کے ساتھ ساتھ اسے ایک بڑا ادبی مرکز تصوّر کرتے تھے۔ دلّی نے جولسانی معیار بندی اور لکھنؤ نے ہندوی اندازِ نظر کو فروغ دیا تھا، عظیم آباد نے اسے یکجا کر کے ایک ایسا لسانی تجربہ کیا جو اردو کا مستقل لہجہ بنا اور شاد عظیم آبادی نے یوں پیش کیا :

نمک ہے فارسی کا، درد ہندی شاعری کا ہے
یہ اردوے معلّا نکتہ سنجانِ عجم دیکھیں

عظیم آباد کا ادبی اسکول اسی شعر کی ترجمانی اور اسی ادبی رویّے کو عام کرنے کے لیے اردو میں مستقل اہمیت کا حامل بنا۔

مختصر گفتگو

۱۔ بہار میں دورِ اوّل میں اردو کو فروغ دینے والے صوفیۂ کرام کے نام لکھیں۔
۲۔ دبستانِ عظیم آباد سے تعلق رکھنے والے آٹھ شاعروں کے نام قلم بند کریں۔
۳۔ عظیم آباد سے میر امّن کے تعلّق پر ایک نوٹ لکھیں۔
۴۔ عظیم آباد دبستان سے تعلّق رکھنے والے بیسویں صدی کے دس شعرا کے نام لکھیے۔
۵۔ جمیل مظہری کے چار اشعار زبانی یاد کر کے لکھیے۔

تفصیلی گفتگو

۱۔ دبستانِ عظیم آباد کے وجود میں آنے کے اسباب کیا ہیں؟ مفصّل لکھیں۔
۲۔ دلّی اور لکھنؤ کی ادبی اجارہ داریوں کے خلاف دبستانِ عظیم آباد توازن اور اعتدال کی مثالی پیش کرتا ہے۔ اس قول کا ناقدانہ جائزہ لیجیے۔
۳۔ شاد عظیم آبادی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالیے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

علی گڑھ تحریک

سرسیّد کی رہنمائی میں علی گڑھ کا تعلیمی تجربہ ہندستانی مسلمانوں کے ذہن وفکر اور عمل میں ایک انقلاب کا اشاریہ ہے۔ اپنی حکومت کے چھن جانے اور انگریزوں کی غلامی کی چکّی میں پستے ہوئے سماج کو سرسیّد نے تعلیم کے مغربی طوفان سے مقابلے کا ایک نسخۂ کیمیا عطا کیا تھا۔ روایت کی جکڑ بندیوں اور مذہب کے حصار کو پار کیے بغیر تعلیم کے نئے منظرنامے کی طرف نہیں آنا تھا، سرسیّد اس سے واقف تھے۔ اس لیے انھوں نے صرف مغربی تعلیم کے پیانے چھلکانے پر اکتفا نہیں کیا۔ تہذیب، ثقافت، مذہب، ادب، سیاست، عورتوں کے مسائل، پیشے ور قوموں کی بہتری کے بارے میں غور وفکر، انگریزوں سے تعلق، معاشرۂ قدیم کے بارے میں ایک نیا تصوّر اور ہم وطن برادران سے شیر وشکر ہونے جیسے مختلف فیہ اور گوناگوں مسئلوں کی بنیاد پر انھوں نے اپنے تعلیمی نظریات پیش کیے۔ یہ ہماری کوتاہ نظری ہے کہ علی گڑھ تحریک یا سرسیّد کو صرف مغربی تعلیم کو مقبول بنانے میں محدود کرکے اس کے بے پایاں اور وسیع پیمانے پر فیضان کے سلسلے سے ان دیکھی کرتے ہیں۔

علی گڑھ تحریک ایک دن میں قائم نہیں ہوئی اور نہ سرسیّد ایک دن میں اس تحریک کے لیے اپنے ذہن کو تیار کر سکے۔ سرسیّد کے پاس کوئی جادو کی چھڑی بھی نہیں تھی۔ وہ جانتے تھے کہ معاشرے کو بدل دینا اتنا آسان بھی نہیں۔ اس لیے انھوں نے مستحکم تیاری کی۔ علی گڑھ کالج قائم ہونے سے پہلے سرسیّد کی علمی اور سماجی حیثیت کا اعتراف ایک عالَم کرنے لگا تھا۔ ان کے پاس کارپردازوں اور اپنے ہی جیسے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے والے بڑی تعداد میں جمع ہو چکے تھے۔ اہالیانِ وقت سے ربط کا سلسلہ بھی چل چکا تھا۔ غدر کے بعد سرسیّد کے نقطۂ نظر میں یہ مثبت تبدیلی آئی تھی کہ اپنی قوم کو خوابِ غفلت سے جگائے بغیر نجات کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ انگلستان کے سفر نے سرسیّد کے خوابوں کو واضح شکل عطا کرنے کے لیے آخری پتّھر کا کام کیا۔ کیمبرج اور آکسفورڈ یونی ورسٹی یا اسپکٹیٹر اور ٹیٹلر نے ان خوابوں کو اس طرح تعبیر کی ردا عطا کی کہ انگلینڈ سے لوٹتے ہی رسالے سے لے کر کالج اور یونی ورسٹی کے بارے میں فیصلے شروع ہو جاتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے پانچ برس میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (Mohammedan Anglo Oriental College) قائم ہو جاتا ہے۔

یونی ورسٹی یا کالج سے پہلے سرسیّد نے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' جاری کیا۔ اس سے پہلے ''آثار الصّنادید'' اور ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' جیسی بیش قیمت کتابیں سرسیّد پیش کرکے لوگوں کی داد لے چکے تھے۔ اپنے خیالات اور تصوّرات کی بنیاد پر یونی ورسٹی قائم ہونے سے پہلے ہی سرسیّد ایک نئے مکتبِ فکر کی حیثیت سے اپنی جگہ بنا چکے تھے۔ اس زمانے کی بڑی شخصیات

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

میں غالبؔ، امام بخش صہبائی، رجب علی بیگ سرور، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ، الطاف حسین حالیؔ، شبلی نعمانی، چراغ علی، محسن الملک اور وقارالملک جیسے لوگوں سے سرسیّد کا ربط ان کی شخصیت کی وسیع المشربی کا اشاریہ ہے۔ سرسیّد کے حلقے میں علم الحساب سے لے کر تاریخ و جغرافیہ تک اور سائنس سے لے کر شعرو ادب تک ہر طبقے کے لوگ اپنی جان نچھاور کرنے کے لیے تیار تھے۔ علی گڑھ تحریک ہندستانی مسلمانوں کے ذہن پر اس لیے اثر انداز ہوئی کیوں کہ ان کے ذہن و فکر میں پیدا ہو رہے سارے سوالوں کا جواب اس تحریک کے پاس ہے۔ سرسیّد کی کامیابی کے پیچھے ان کے رفقا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔

1857 کے بعد اس انقلاب کے تجزیے کا مشکل کام تھا۔ سرسید نے مغربی تعلیم کو عام کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے مسلمانوں کو آواز دی۔ ان کی کوششوں سے ہندستانی مسلمانوں کے اعلا طبقے میں جدید تعلیم کے لیے جو جذبہ پیدا ہوا، اس نے برادرانِ وطن سے آگے یا مساوی مقام تک رکھا۔ تقسیمِ ملک تک نوکریوں میں مسلمانوں کی بڑی تعداد، سرسید کے اجتہاد کا اثر ہے۔ اگر سرسیّد نے مذہبی روایات اور محدود معاشرت کے بھنور میں پھنسے ہوئے مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی جانب راغب کرتے ہوئے علی گڑھ کالج کا آسمان نہیں فراہم کیا ہوتا تو ہندستانی مسلمانوں میں جدید تعلیم کا تناسب شاید صفر کے آس پاس رہتا۔

سرسیّد اس زمانے کے سماجی اور مذہبی مسئلوں پر بھی اپنی مخصوص رائے رکھتے تھے۔ 1857 سے ہی ہندستان میں یہ سلسلہ چل پڑا تھا کہ انگریزوں کو کیسے ملک سے باہر کیا جائے۔ سرسیّد انگریزوں کو ہمیشہ کے لیے اس ملک میں رکھنے کے طرف دار نہیں تھے۔ اپنے ایک خط میں وہ لکھتے ہیں کہ کبھی ایسا بھی وقت آئے گا کہ ہم ہندستانی اپنے ملک کا خود قانون بنائیں لیکن فوری طور پہ ان کی حکمتِ عملی یہ تھی کہ انگریز جیسی ترقی یافتہ قوم سے مقابلہ کرنے سے بہتر اشتراک کا پیمانہ بڑھانا اور دنیوی فیوض و برکات سمیٹنا زیادہ ضروری ہے۔ اسی لیے جب 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس (Indian National Congress) کا قیام عمل میں آیا تو سرسیّد نے اس کے ساتھ پیہم گزارشات کے باوجود دست تعاون بڑھانے سے انکار کیا۔ گوکھلے اور بدرالدین طیّب جی کے نام سرسیّد کے جو خطوط ہیں، ان سے ان کے سیاسی شعور کا پتا چلتا ہے۔ سرسیّد کی موت تک کانگریس کوئی عوامی یا کل ہند تنظیم نہیں بن سکی تھی اور نہ ہی ہندستانی سیاست کا وہ موڑ آیا تھا جب کانگریس پورے ملک کی ترجمان ہو جائے۔ سرسیّد کے اعتراضات اس وقت تک صحیح تھے اور وہ تنظیم ہندستانی مسلمانوں کے مستقبل کا ضامن نہیں بن سکتی تھی۔ Discovery of India میں جواہر لال نہرو نے سرسیّد کے اس فیصلے کو اس وقت کے اعتبار سے صد فیصد صحیح تسلیم کیا ہے۔ یہ اندازہ کرنے کی بات ہے کہ اگر سرسیّد 1920 کے بعد کانگریس کے عوامی مورچے کو دیکھتے تو شاید سرگرم اشتراک کے لیے خود سے دوڑ پڑتے۔

سرسیّد کے مذہبی تصورات پر بھی اکثر گفتگو ہوتی رہتی ہے۔ اپنے زمانے میں انھیں ایک طبقے نے گمراہ تسلیم کیا۔ ان کی تفسیر پر علما نے اچھا خاصا اعتراض کیا۔ ہندستانی معاشرے کو مذہب کا ایک عصری تصور قبول کرنے میں دشواری تھی۔ سرسیّد عقل کے حوالے سے عقیدت کی بزم آرائیوں کو تولنا چاہتے تھے، یہ کام آسان نہیں تھا۔ سرسیّد کی دلیلیں مذہب کے معاملے میں ان لوگوں کے لیے بھی زود ہضم تھیں جنھیں سرسیّد کا رفیق یا ہم نوا مانا جاتا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد، شبلی نعمانی اور اکبر الہ آبادی روایت پرست نہیں تھے لیکن سرسیّد کے تصوّر کے نکتہ چیں تھے۔ علمائے کرام کی بہت بڑی جماعت تھی جو انھیں 'فسادی مُلّا' کہتی تھی لیکن یہ سرسیّد کا

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

جگر تھا جس نے تمام حملوں کو جھیلتے ہوئے اپنی عقل اور نقطۂ نظر پر اعتبار جاری رکھا۔ اگر ایسا نہیں ہوا ہوتا تو ہندستانی مسلمانوں کی بیداریٔ نو میں سرسیّد کی شخصیت رہنما نہیں بنتی۔

سرسیّد کے زمانے میں فارسی حکومت کی زبان تھی اور عوامی زبان کے طور پر اردو مرکزیت رکھتی تھی۔ سرسیّد کی ابتدائی کتابوں کا تعلق فارسی سے ہے، بعد میں انھوں نے اردو کو ذریعۂ اظہار بنایا۔ انھیں معلوم تھا کہ اس زبان کی جدید کاری کیے بغیر وہ ہندستانی مسلمانوں کے ذہن کے بند دروازے اور کھڑکیوں کو نہیں کھول سکتے۔ گل و بلبل اور کاکلِ محبوب کی پرچھائیں میں اردو زبان جدید عہد تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ سرسیّد نے نہ صرف اپنی تحریروں سے اس زبان کے مشتملات بدلنے کی کوشش کی بلکہ مختلف اصناف اور شعبوں کے ماہرین کی ایسی تربیت کی جن سے اردو زبان ایک انقلاب آفریں دور میں پہنچ گئی۔ سرسیّد، حالی، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، شبلی، سرشار، ذکاء اللہ جیسے اصحاب کی ادبی خدمات یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ سرسیّد کے اُس طرف ایک دوسری اردو تھی اور سرسیّد کے اِس طرف ایک دوسری اردو ہے۔ پہلے کی اردو روایت کے جال میں شکست خوردہ صورت نظر آتی تھی۔ سرسیّد کے بعد کی اردو نئے معاشرے اور نئے تقاضوں کی بنیاد پر ایک زندہ جاوید ادبی سرمایہ ہے۔ شاعری سے نثر کی طرف مراجعت کا بھی پہلا سبق سرسیّد نے دیا تھا۔ یہ سوچ کر آج خوف آتا ہے کہ سرسیّد نے اپنے رفقا کے ساتھ مل کر اردو زبان وادب کے مقدر کو نئی شکل عطا کرنے کی کوشش نہ کی ہوتی تو شاعری کے علاوہ ہمارے ہاتھ خالی ہوتے۔

ایسا نہیں ہے کہ سرسیّد علمی اعتبار سے اپنے رفقا کی خدمات کی وجہ سے یاد کیے جاتے ہیں۔ تاریخ، تہذیب، مقالہ نویسی، صحافت اور خطبہ نگاری کے شعبے میں سرسیّد نے خود بھی بڑی تعداد میں تحریر و تصنیف کا کام انجام دیا۔ اسماعیل پانی پتی نے سرسیّد کے لکچروں کا مجموعہ تیار کیا تو اس کے دفتر تیار ہو گئے۔ سرسیّد کی تحریروں میں انگریزی لفظوں کی بہتات اور 'کر کر' کی تکرار آج ہمارے ذہنوں پر بوجھ ہیں۔ لیکن ہر ابتدائی کام کرنے والے کے یہاں یہ بے احتیاطی لازم ہے۔ اس کی وجہ سے سرسیّد کی تصنیفی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

زندگی کے مختلف شعبوں کے تعلق سے سرسیّد کی خدمات کا جائزہ لیتے وقت ہماری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں کہ ایک شخصیت کے اثر سے قوم کے سیاہ و سفید کیسے بدل گئے۔ یہ تبدیلی صرف تعلیم اور تہذیب کے شعبے میں نہیں ہوئی بلکہ شعر و ادب کے حلقے میں بھی انقلاب آفریں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جدید ہندستان کے طول و عرض پر جب نظر ڈالتے ہیں تو سرسیّد جیسی کوئی دوسری شخصیت ہمیں نہیں ملتی جس نے ملک و قوم کو ہزار طریقوں سے متاثر کرنے کا فرض ادا کیا ہو۔ علی گڑھ تحریک ایک شہر کی تحریک نہیں تھی اور نہ سرسیّد محض ایک شخصیت تھے۔ نئے ہندستان کی تعمیر کا خاکہ کہ سرسیّد کی رہنمائی میں علی گڑھ میں تیار ہوا، اسی میں ہم آج تک رنگ بھر کر روشنی اور چمک پیدا کر رہے ہیں۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

مختصر گفتگو

۱۔ علی گڑھ تحریک کا پس منظر واضح کیجیے۔

۲۔ سر سیّد کے نامور رفقا کی فہرست بنائیے۔

۳۔ جواہر لال نہرو نے سر سید کے کس فیصلے کو درست قرار دیا تھا؟

۴۔ سر سیّد نے کن خاص علوم میں اپنے جوہر دکھائے؟

تفصیلی گفتگو

۱۔ اردو ادب پر علی گڑھ تحریک کے اثرات واضح کیجیے۔

۲۔ سر سیّد کی تعلیمی کوششوں سے اپنی واقفیت کا اظہار کریں۔

۳۔ سر سیّد کے سیاسی نظریات پر اپنی رائے ظاہر کیجیے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

ترقّی پسند ادبی تحریک اور اس کے اثرات

اردو میں ترقّی پسند ادبی تحریک نے پہلی بار ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو ایک مقام پر جمع کر کے ان کے ادبی اعتقادات کی قومی اور بین الاقوامی ترجمانی کا خواب دیکھا تھا۔ ان معنوں میں یہ پہلی تحریک تھی جس کے پیچھے ارادوں کا دخل ہو۔ اِس کے قبل اردو میں جو تحریکیں سامنے آئیں، وہ غیر ارادی طور پر ابھر گئی تھیں۔ ایہام گوئی، اصلاحِ زبان، فورٹ ولیم کالج۔ ان تینوں تحریکوں میں اس زمانے کے لکھنے والوں کے اجتماعی ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ علی گڑھ تحریک ادبی فروغ کے مقصد سے نہیں کھڑی ہوئی تھی۔ اس لیے یہ مانا جاسکتا ہے کہ یہ بھی اپنے آپ پیدا ہوئی ادبی تحریک بن گئی لیکن ترقّی پسند تحریک دنیا بھر میں مخصوص مقاصد اور نشانوں کو نظر میں رکھ کر شروع کی گئی تھی۔

اردو میں جب اس تحریک کا آغاز ہو رہا تھا، اُس وقت بھی اس کے اغراض و مقاصد واضح تھے۔ ہندستان کی قومی تحریک سے بھی ترقّی پسند تحریک نے ربط باہمی کا سلسلہ رکھا اس لیے فوری طور پر یہ اپنی مقبولیت کے عروج تک پہنچ گئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ 1950 کے بعد اِس تحریک نے زوال کی طرف رُخ کیا اور اُسی دہائی میں جدیدیت کے فروغ کے پہلے اِس نے اپنا بوریا بستر سمیٹ لیا۔ اس کے باوجود بعد کے ادب میں بھی ترقّی پسندانہ نقوش دیکھے جاسکتے ہیں۔ ادب کے طالب علم کے لیے یہ سوال کافی اہم ہے کہ اس تحریک کے زیرِ اثر لکھے جانے والے ادب کا جائزہ لے کر یہ طے کیا جائے کہ واقعتاً ہمیں اس تحریک نے کیا دیا؟ اِسی سوال کا دوسرا منطقی پہلو یہ ہے کہ اُن امور کی نشاندہی کی جائے کہ ترقّی پسندی جن تصوّرات اور نظریوں کو لے کر آگے بڑھی تھی، کیا اردو پر ان کے دائمی اثرات مرتّب ہوئے؟ ترقّی پسند ادیبوں اور شاعروں نے جو نئے تجربے کیے، کیا انھیں بعد کی نسلوں نے اپنے لیے رہنما تصوّر کیا؟ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ترقّی پسندی آج بھی اردو ادب میں رویّے کے طور پر زندہ ہے تو یہ سوال اہم ہو جاتا ہے کہ موجودہ ادبی سرمایے کے تناظر میں بھی ترقی پسندانہ تصوّرات کی موجودگی کا محاسبہ کیا جائے۔

اردو میں ترقّی پسندی اوّلاً اقبالؔ، پریم چند اور انگارے کے افسانہ نگاروں کے طفیل اپنی بنیاد استوار کرتی ہے، ترقّی پسندی کے بڑے سوالات انھیں لوگوں نے ابتداً اٹھائے تھے۔ اقبالؔ نے عالمی تناظر، مذہبی اداروں کے خلاف ردِ عمل اور ادب، سیاست، مذہب میں رشتے کی بات سامنے لادی تھی۔ پریم چند نے کسان اور مزدور کی مرکزیت، دیہی سماج اور شہری سماج کے مناظرے، زبان کی سطح پر عوام کی طرف جھکاو اور کمزور لوگوں کی طرف داری جیسے بالکل نئے سوالات ہندستانی ادب میں قائم کیے۔ 'انگارے' کے مصنّفین نے آزادیِ اظہار، عورت اور مرد کے رشتوں کی وضاحت اور آزادیِ نسواں جیسے اہم معاملات کو

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

مرکزیت عطا کر کے ادبی آسمان کو مزید وسیع کرنے کا خواب دیکھا تھا۔

اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک انھیں بنیادوں پر قائم ہوئی۔ مختلف اصناف میں اہم لکھنے والوں کی بہترین نگارشات کے دائرۂ کار کا واضح تعین کیا جائے تو بہت کم ان سے الگ نوعیت کے سوالات کھڑے ہوں گے۔ بعد کے ادبی سرمایے پر غور کریں تو یہ موضوعات مزید اہمیت حاصل کر لیتے ہیں کیوں کہ ان میں سے بیش تر کی موجودگی جدیدیت اور مابعد جدید دونوں زمانے میں رہی۔

ادبی اور سماجی موضوعات پر اردو کے علمی حلقے میں نرم گرم بحثوں کا جو سلسلہ ہنوز قائم ہے، اس کی پشت پر ترقی پسندوں کی گہری تربیت کا اثر ہے۔ 1936 سے 1950 تک ادبی رسائل میں جو گہما گہمی رہی، وہ ترقی پسندی کے ختم ہونے کے باوجود کبھی زائل نہیں ہوئی۔ ادب کیسا ہو، کس طرح لکھا جائے اور جو کچھ لکھا جا چکا ہے، اس کی ضرورت اور افادیت کیا ہے، اِن جیسے سوالوں پر ترقی پسندوں نے آر پار کی جو بحث شروع کی، وہ ہر دور میں ہوتی رہی ہے۔ جدیدیت کے دور میں اور مابعد جدید زمانے تک ان سوالوں پر صرف بڑے لکھنے والوں کے جوابوں پر اطمینان کر کے بیٹھ جانے کا رویہ آج ادبی سماج میں نہیں ہے بلکہ ایک معمولی اور ادبی اعتبار سے غیر اہم لکھنے والا بھی ان سوالوں پر اپنی انفرادی رائے دینا چاہتا ہے۔

ترقی پسند تحریک نے ادب کو انسان کی سماجی توقعات کا اشاریہ مانا تھا۔ اسی سے ادب اور زندگی کے گہرے رشتوں کی وضاحت ہو سکی۔ جدیدیت کے زمانے میں حالاں کہ ''ادب برائے ادب'' کو ترجیح دینے کی کوشش ہوئی لیکن رفتہ رفتہ بھی جدید اہلِ قلم ادب کے سماجی انسلاک کو تسلیم کرنے والے بنے۔ آج جدید اور مابعد جدید تحریروں میں تہذیب و ثقافت اور سماجی مسائل کو بنیادی اہمیت کا حامل تصور کیا جاتا ہے تو اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جائے کہ ترقی پسند تحریک نے جو سوالات اٹھائے تھے، وہ اب معدوم ہو چکے ہیں۔

ترقی پسندوں کو پریم چند کی زراعتی سوسائٹی روایت میں ملی تھی لیکن راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ اور احمد ندیم قاسمی کو چھوڑ کر دیہاتی سماج کو مرکزیت دینے میں بقیہ لکھنے والوں نے کچھ خاص سرگرمی نہیں دکھائی۔ ترقی پسندوں نے ایک ابھرتے ہوئے شہری تمدن کی طرف آنکھ لگا رکھی تھی۔ آج ہندستان رفتہ رفتہ شہری سماج بنتا جا رہا ہے۔ نئی آبادیوں اور شہروں کے مزاج سے اردو کا اس کی پیدائش کے وقت سے ایک گہرا تعلق ہے۔ ترقی پسند اہلِ قلم نے اردو کی اس بنیادی سرشت کو پہچانا اور اپنے ادب میں شہری سماج پر خاص توجہ دی۔ گذشتہ نصف صدی میں شہری تہذیب و تمدن کے مظاہر اردو میں سب سے زیادہ آئے۔ اگر دیہات اور شہر کے تنازعے میں ترقی پسند ادیبوں نے واضح فیصلہ نہیں کر دیا ہوتا تو بعد کے لکھنے والوں کے لیے یہ آسان نہیں تھا کہ کسی ایک طرف ہو جائیں۔ ترقی پسند تحریک کا ہی یہ اثر ہے کہ موجودہ اردو ادب شہری تہذیب و تمدن کا عکاس بنا ہوا ہے۔

ہندستان ایک روایتی اور مذہبی سماج رہا ہے جہاں عورتوں کی تعلیم اور ان کے سماجی رول پر بہت دیر سے ہمدردانہ رائے قائم ہوئی۔ لیکن ہندستان کی کسی زبان سے پہلے اردو میں روایتی اور جدید دونوں قسم کی عورتیں سامنے آتی ہیں۔ انیسویں صدی میں اردو کی ادیبہ رشیدۃ النسا نے اس زمانے میں ''اصلاح النسا'' کے نام سے ناول لکھا جب کتابوں پر مصنفہ کی حیثیت سے

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

عورتوں کے نام نہیں لکھے جاسکتے تھے۔ 'انگارے' میں جب رشید جہاں کا افسانہ اور ڈراما شامل کیا گیا، اس وقت بھی عورتوں کے تعلّق سے ہندستان کا سماجی ماحول کچھ خاص بدلا ہوا نہیں دکھائی دیتا لیکن رشید جہاں بالکل ایک نئی دنیا کی خاتون ہیں۔ 1942 میں عصمت چغتائی جب 'دوزخی' اور 'لحاف' لکھتی ہیں تو انھیں محبت سے ''لیڈی چنگیز خاں'' تک کہا گیا۔ ان کے افسانوں پر مقدّمے قائم ہوئے اور گھر کی چہار دیواری میں قید رہنے والی عورت عدالت کے کٹہرے تک پہنچی۔

ترقّی پسند تحریک کے تمام کام اگر وقت کی رَو میں ختم ہو جائیں اور صرف اردو کے ادبی منچ پر عورتوں کی طاقت ور شراکت قائم رہ جائے تب بھی ترقّی پسند تحریک کے اثرات شاید ہزاروں سال رہیں۔ آج اس پر شاید ہی اختلاف ہو کہ اردو کی سب سے بڑی مصنّفہ قرۃ العین حیدر تھیں۔ یہ بدلی ہوئی صورت ترقّی پسند تحریک کا احسانِ عظیم ہے۔ آج اردو کی ادیبہ فہمیدہ ریاض اور کشور ناہید عالمی خواتین کانفرنس اور اقوامِ متحدہ کے مختلف پروگراموں میں نمایندہ بن رہی ہیں تو کیا اسے ترقّی پسندوں کی صالح تربیت کا نتیجہ نہیں مانا جائے؟

آزادی کے بعد اردو لکھنے پڑھنے والوں میں مسلمانوں سے الگ دوسری مذہبی آبادیوں نے حصّہ لینا کم کر دیا اور رفتہ رفتہ یہ زبان مسلمانوں کے حلقے میں سمٹ آئی۔ اس کے باوجود مشترکہ تہذیبی وراثت کے موضوع سے اس کے خمیر میں کوئی بدلاو نہیں آیا۔ ترقّی پسندوں نے اگر غیر مذہبی بنیاد پر شعر و ادب کی تفہیم کے لیے ماحول قائم نہیں کیا ہوتا تو شاید آج اردو فرقہ واریت کی نقیب بن جاتی۔ یہ یاد رکھنے کی بات ہے کہ ترقّی پسند تحریک کی اٹھان اور جارح قومیت (فرقہ واریت) کی شعلگی ایک ہی زمانے کی چیزیں ہیں۔ اگر ترقّی پسندوں نے ادب اور سماج کے ان سوالوں پر دور اندیشی سے کام نہیں لیا ہوتا تو آج ہم ایک بدلی ہوئی صورتِ حال سے دوچار ہوتے۔ مذہبِ اسلام کے نام پر ادبی روایتوں اور تحریکوں کی جو کوششیں بیچ بیچ میں ہوئی ہیں، انھیں اردو عوام نے نہ کبھی اہمیت دی اور نہ کبھی زور پکڑنے دیا۔

ترقّی پسند تحریک نے اپنے زمانے کی سیاسی اور سماجی تحریکوں کے ساتھ تعلّق قائم کیا تھا۔ قومی تحریک کے آغاز کے بعد تلنگانہ، نکسل باڑی آندولن اور ملک بھر میں چل رہیں تحریکیں اردو کے موجودہ ادب کو متاثر کر رہی ہیں۔ آج کے افسانے اور ناول اِس کے بہترین آئینہ دار ہیں۔ ہندستان کی دوسری زبانوں میں بھی جو تحریکی اور انقلابی ادب لکھا جا رہا ہے، اہلِ اردو نے اس کا اچھا خاصا ترجمہ کر رکھا ہے۔ ترقّی پسندوں نے اگر ہماری تربیت نہ کی ہوتی تو شاید ہی اس طرف ہماری نگاہ جاتی۔

ترقّی پسند تحریک کے زمانے میں ہی پہلی بار اردو ادب نے عالمی سطح پر اٹھ رہے سوالات کو مرکزِ نگاہ بنایا۔ اس کے پہلے تک اردو اور اہلِ اردو اپنے ہی مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ آج دنیا کے اہم اور غیر اہم، سماجی، سیاسی اور مختلف طرح کے سوالات پر شعر و ادب اور دوسرے منچوں پر اردو کے لکھنے والے اپنی دانشورانہ رائے پیش کرتے ہیں۔ ہندستان اور پاکستان میں جب نیوکلیر ٹسٹ ہوتے ہیں تب انتظار حسین کی کہانی، انور سجّاد کا مضمون اور درجنوں ادیبوں کے ردِّ عمل کے ساتھ ماضی میں دوسری جنگ عظیم اور 1942 کی تحریک کے تعلّق سے ترقّی پسند ادیبوں کا ردِّ عمل یاد رکھنا چاہیے۔

ترقّی پسند ادبی تحریک نے ادب کا دروازہ کشادہ کیا، ادیبوں کی سماجی اہمیت اور ان کی رائے کے اعتبار کو بڑھایا، ایک

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

چھوٹے جغرافیائی خطّے یا بند کمرے سے نکال کر اردو لکھنے والوں کو عالمی شہری بنایا۔ اپنے زمانے کے مسائل پر بے باکی اور ضرورت پڑنے پر برہمی کے ساتھ بھی رائے دینے کا سلیقہ عطا کیا۔ ادب یا ادیب کوئی حاشیے کی چیز نہیں ہیں۔ سماج میں ان کی اہمیت افکار و نظریات کے بنانے والوں کی ہے۔ اس لیے ان کے تئیں اہلِ اقتدار کا رویہ بھی مناسب ہونا چاہیے۔ ادب اور شاعری معروضی بنیادوں پر فروغ پاتے ہیں، انھیں تنگ نظری سے کوئی علاقہ نہیں۔ ترقّی پسند تحریک نے جو یہ سارے سوالات اپنے زمانے میں قائم کیے، وہ آج بھی اردو کی رگ و پے میں موجود ہیں۔ کہنا چاہیے کہ اردو نے ان امور کو اپنی روح کا حصّہ بنالیا۔ اس لیے ترقّی پسند تحریک کے گونا گوں اثرات اور احسانات سے انکار کرنا حقائق سے چشم پوشی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اردو کا موجودہ ادب بھی ترقّی پسندوں کے بعض بنیادی راستوں پر چل رہا ہے اور آیندہ بھی ایسے امکانات نظر نہیں آتے کہ اردو اس راستے سے الگ ہوگی۔

مختصر سوالات

۱۔ ترقّی پسند ادبی تحریک کن بنیادوں پر قائم ہوئی؟

۲۔ موجودہ اردو ادب شہری تہذیب و تمدّن کا عکاس بنا ہوا ہے۔ کیسے؟

۳۔ آزادی کے بعد اردو لکھنے والوں میں کیا فرق آیا؟

۴۔ ترقّی پسندوں نے غزل گوئی کی طرف عدم توجّہی کا رُکھ کیوں اپنایا؟

۵۔ درجِ ذیل ترقّی پسند شعرا کی دو دو نظموں کے عنوان لکھیں :

فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، مجاز، ساحر لدھیانوی۔

۶۔ ترقّی پسند ناولوں کے موضوعات اور دائرۂ کار کا تعیّن کن مصنّفین کے قلم سے ممکن ہوا۔ ایسی چند تحریروں کے نام بھی درج کریں۔

۷۔ اردو افسانے کی سب سے طاقت ور نسل میں کن کا شمار ہوتا ہے؟ ان کے ایک ایک افسانوی مجموعے کا بھی نام لکھیں۔

۸۔ درجِ ذیل کتابوں کے مصنّفین کے نام لکھیں : احتشام حسین، اختر انصاری، مجنوں گورکھ پوری، علی سردار جعفری، محمد حسن۔

تفصیلی سوالات

۱۔ ترقّی پسند تحریک کے اثرات واضح کیجیے۔

۲۔ ترقّی پسند ادبی تحریک کے کارناموں کو بیان کیجیے۔

۳۔ ترقّی پسند تحریک میں عورتوں کی طاقت ور شراکت کی مثالیں پیش کیجیے۔

© Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...

۴۔ ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے کس روایت کی بنیاد رکھی جس کے بعد کی نسلیں اپنے لیے رہنما تصور کر سکے؟

۵۔ ترقی پسند غزل گوئی کا محاسبہ کیجیے۔

۶۔ ترقی پسندی کے دور میں صنفِ نظم کے ارتقا کے اسباب کیا ہیں؟ اس دور میں ہیئت اور موضوع کی سطح پر کون سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

۷۔ عظیم ترقی پسند ناولوں پر اپنے تاثرات قلم بند کیجیے۔

۸۔ ''ترقی پسند افسانے کی موضوعاتی دنیا پریم چند سے الگ ہے۔'' اپنی رائے مدلل پیش کریں۔

۹۔ ''فنِ تنقید اور ترقی پسند تحریک''۔ اس عنوان سے ایک مقالہ سپردِ قلم کریں۔

Copy right received only to BSTBPC, Govt of Bihar and Abdiel Solutions (www.absol.in). Publishing (web/App/Books) will be crime
Abdiel Solutions
Empowering Technologies...